© rasailojaraid.com

حامد سراج

دہاڑی

خزاں اور بہار کی درمیانی رت تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر میرے اردگرد سرپٹخ رہے تھے۔ شیشم کی اونچی شاخ پر ایک پرندہ چونچ میں دانہ لئے آیا۔ خزاں رسیدہ درخت کی ننگی ٹہنیوں پر وہی ایک گھونسلہ بہار کی علامت تھا۔ اس میں زندگی اور بہار کے آثار تھے۔ لان کے اطراف میں لگے اکادکا کیلی کے پودوں پر سرخ اور پیلے پھول کھلے تھے۔ میں ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح رسالے کے اوراق بھی پھڑپھڑ ارہے تھے اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں یا سوچ رہا ہوں۔ شاید میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ تو کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں تحریروں کا ایک جال بچھا تھا، پرندے بول رہے تھے اور میں سلیمان نہ تھا کہ ان کی بولی سمجھ لیتا۔ وہ یقینی طور پر ایک دوسرے کو اپنی کتھا سنا رہے تھے۔ بان کی کھردری چارپائی کی پائنتی رکھی ٹرے میں چائے کی پیالی سرد ہو گئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ جیسے ہی کسی پرندے کی چونچ سے کوئی کہانی گرے میں اسے اٹھا کر سنبھال لوں اور مکمل کر کے کسی جریدے میں اشاعت کے لئے بھیج دوں۔ لیکن خیال آیا۔۔۔۔ یہ شوق نام وری کس لئے۔۔۔۔؟ کسی پرندے کی چونچ سے گری ہوئی کہانی تو میری اپنی سوغات ہے میں اسے عام کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایسی کہانیاں سنبھال کر کیوں نہیں رکھتا۔ کیا یہ تحریریں بھی کسی کی امانت ہیں؟ جو ہمیں لوٹانی ہیں۔ تخلیق کار کو معلوم ہی کب ہوتا ہے کہ وہ کس لئے تخلیق گری کے عمل سے گذر رہا ہے؟ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے؟ معاشرے یا پھر کائنات کے لئے۔۔۔۔؟ میرے آنگن میں کوئی پنجرہ نہیں۔۔۔۔ میں نے پرندے کبھی قید نہیں کئے۔ بچپن میں چین کے طوطے جو پیغام لائے تھے، وہ میں آج تک نہیں بھولا۔ مجھے قید سے نفرت ہے۔۔۔ قید جبر کی علامت ہے، پرندے اور کہانیاں قید نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ قید ہو جائیں تو فضا میں گھٹن بڑھ جاتی ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے۔ میں گھر کے آنگن میں مٹھی بھر باجرہ بکھیر دیتا ہوں، پرندے دانا چگتے، چہچہاتے اور مجھے کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ کہانی تلاش کرنے کے لئے میں اٹھا، اندر سے باجرہ نکال کر صحن میں بکھیر دیا۔ تھوڑی دیر میں چڑیاں، لالیاں، کال کھڑچی، کوے اور ہدہد میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ ابھی وہ دانہ چگ ہی رہے تھے کہ ایک دم اڈاری مار کر اڑ گئے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔۔۔۔ سامنے پگڈنڈی پر ایک شخص آ رہا تھا۔۔۔۔ دھیمی چال چلتا ہوا۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔ اس کے پاؤں میں گانٹھ لگی چپل، سر پر بوسیدہ میلی سی پگڑی اور بغل میں خالی بوریاں تھیں۔ پرندوں کی جگہ چارپائی پر وہ آ کر بیٹھ گیا۔ کہانیاں پرندے اپنے ساتھ لے اڑے اور میں رسالے کے اوراق میں سے پرندے تلاش کرنے لگا۔

اتنے میں، خزاں کی خامشی میں ایک آواز ابھری "چار چار روپے۔۔۔۔" "سستیاں لے لو۔۔۔۔ چار چار روپے۔ میرا جی چاہا اٹھ کر ایک چنگیر لے لوں۔ ممکن ہے چنگیر میں روٹی کی بجائے کوئی کہانی رکھی ہو۔ اور بیچنے والی کی جیب میں رقم کی بجائے بھوک رکھی ہو۔۔۔ وہ خزاں رسیدہ چہرے والی ایک پستہ قد عورت تھی اس کے کپڑوں میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔ وہ گذر گئی۔ میں چنگیر سے کہانی اٹھا سکا نہ اس کی جیب سے بھوک۔ دیر تلک اس کی پشت پر لٹکتے جھولے اور سر پر دھری چنگیروں کو دیکھتا رہا۔ رسالے کے اوراق چپ ہو گئے۔۔۔۔ گونگے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہرے۔۔۔ان کی قوت گویائی کیا ہوئی۔۔۔۔؟ان سے نطق کس نے چھین لیا۔۔۔؟

یہ آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ ہم سب کہاں سے آئے ہیں۔۔۔؟ ہمیں جانا کہاں ہے ۔۔۔۔ہمارے سروں پر رکھی چنگیروں میں کیا ہے؟ روٹی یا بھوک۔۔۔۔۔۔؟ کائنات کی اصل کیا ہے۔۔؟شکم سیری یا فاقہ کشی۔۔۔؟ ہماری چنگیروں میں سے بھوک کہاں اڑگئی ہے؟ قناعت کے سکے ہم کہاں گرا آئے ہیں؟انہیں تلاش تو کرنا چاہیے۔شاید گم شدہ میراث مل جائے۔۔۔!اس آدمی کو یہ بوریاں کھول کر ساری کہانیاں مجھے دے دینی چاہئیں،لیکن میں اسے کیا دوں گا۔۔۔بھوک۔۔۔یا روٹی۔۔۔۔؟اگر یہ ضرورت مند ہوا تو میرے پاس اسے دینے کے لئے کیا ہے؟ کہانیاں۔۔۔؟ کہانیوں سے پیٹ تو نہیں بھرتا، چولہا تو نہیں جلتا۔۔۔افلاس کا تن تو نہیں ڈھانپا جا سکتا۔۔۔!اجنبی شخص نے چارپائی ایک طرف گھسیٹے ہوئے کہا۔درخت کے نیچے نہیں بیٹھنا، پرندوں کی بیٹ گرے گی۔۔۔۔ میں بے روح اوراق پلٹتا رہا۔۔۔۔میرے سامنے بیٹھے شخص کی خواہش تھی کہ میں اس سے باتیں کروں،لیکن کون سی۔۔؟ حالات حاضرہ،موسم،مہنگائی، بیروزگاری،علاقائی سیاست، جنگ،امن،ایٹم،۔۔۔۔کون سی بات۔۔۔۔۔۔؟ وہ آہستہ سے کھنکارا، گلہ صاف کیا، پگڑی سنبھالی، بوریوں کو تھپتھپایا حالانکہ وہ خالی تھیں۔ان میں اناج بھرنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔آپ کیسے ہو۔۔۔؟ وہ گویا ہوا۔ٹھیک ہوں۔۔۔الحمدللہ۔شہر سے کب آئے ہیں؟ کل ہی۔۔۔۔میاں صاحب کے قاتل کا پتہ چلا؟۔۔نہیں۔۔۔!ہائے ہائے کیسے سفاک لوگ تھے،موٹر سائیکل چھین لے جاتے،انہیں تو گولی نہ مارتے۔موٹر سائیکل بھی گیا، جان بھی گئی۔۔۔۔خان صاحب!۔۔آپ کا میاں صاحب سے تعارف کیسے ہے؟اجی۔۔۔ہم ان کے ٹریکٹر پر مزدوری کرتا تھا،مٹی ڈھونے کا کام کرتا تھا،میاں صاحب بہت اچھا انسان تھا،موٹر سائیکل چھیننے والوں کو کیڑے پڑیں،ان کی لاشیں گل سڑ جائیں۔۔۔۔خان جی،آج کیسے آنکلے۔۔۔۔؟''نقش'' لینے آیا ہے جی ۔۔۔بیوی کا دودھ سوکھ گیا ہے اور بچہ بیمار ہے، ہاتھ بہت تنگ ہے،اب تو کہیں مزدوری بھی نہیں مل رہا ہے۔میں خان صاحب کے کھردرے اور سخت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بیلچے نے اتنی روٹی نہیں کمائی تھی، جتنی ہاتھوں نے گانٹھیں کمالی تھیں۔کھردرے ہاتھوں پر محنت کی روٹی رقم تھی، لکیروں کی لکڑیاں ہاتھ کے تنور میں سلگ رہی تھیں،لیکن بوریاں خالی تھیں،وہ پرامید تھا کہ بوریاں بھر جائیں گی''نقش'' سے دودھ اتر آئے گا اور اس کا بچہ کلکاریاں مارنے لگے گا۔اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔وہ مسکرایا اور کہا،میاں صاحب۔۔۔۔ایک عرض کروں، اگر آپ کو برا نہ لگے تو۔۔۔؟ کہو کہو خان صاحب۔۔۔۔وہ جی۔۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔میری۔۔۔۔میاں صاحب کی طرف ایک دہاڑی نکلتی تھی جی۔۔۔۔ساٹھ روپیہ۔۔۔۔!بڑے میاں جی سے آپ کہیے ناں۔۔۔کہ''نقش'' کے ساتھ اگر ساٹھ روپیہ بھی مل جائے تو۔۔۔؟ اچھا۔۔۔!میں اٹھ کر اندر گیا۔۔۔۔میاں جی نے کھاتہ کھولا اسے کھنگالا۔۔۔خان صاحب کی دیہاڑی کہیں رقم نہیں تھی، دیہاڑی کی بجائے وہ''نقش'' لے کر باہر آئے۔اچانک ان کے ہاتھ سے''نقش'' چھوٹ کر گر گیا۔۔۔۔خزاں رسیدہ درخت پر سے کوا اترا، روزی کا لقمہ سمجھ کر اسے چونچ میں دبایا اور اڑ گیا۔

© rasailojaraid.com